مغرب میں اردو افسانہ

ڈاکٹر صائمہ ارم*

Abstract

Literature addresses the problems of people. It is a narrative to understand and depict various aspects of human life and most of the time, people face similar griefs in various part of the world, in one way or the other. Hence literature has no boundaries. Same is the case with Urdu Short story. Various writers, residing in west chose to communicate themselves creatively in Urdu and the process is still on going. Migration, whether forced or optional brings a lot of psychological problems for a person. This article tries to highlight and evaluate some of the writer, who expressed a deep insight to these problems.

اُردو تخلیقی نثر کی تاریخ میں مختصر کہانی یاافسانے کی ہیئت مغرب کے زیر اثر پیدا ہوئی۔ بیسویں صدی کی ابتدا سے افسانہ نما نثر پارے منظر عام پر آنے لگے اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اُردو افسانے کا کینوس خاصا وسیع ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب اُردو افسانے کا زندگی کے مسائل سے براہ راست تعلق جڑ گیا۔ اپنی ابتداء ہی سے اردو افسانہ کسی خاص موضوع، اسلوب، تکنیک، یا جغرافیائی سرحد کا پابند نہیں رہا۔ افسانے کی یہ آزادہ روی ہی اُردو میں مختصر افسانے کی مقبولیت، استحکام اور ارتقاء کا بنیادی سبب ثابت ہوئی۔ مغربی ممالک خصوصاً امریکہ، انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں آباد اُردو کے افسانہ نگاروں نے اُردو افسانے کی سرحدوں کو مزید وسیع کرنے بلکہ عالمی بنانے میں خاطر خواہ کردار ادا کیا ہے۔

ابتدائی طور پر اُردو افسانے کی مغربی جہت اس وقت سامنے آتی ہے جب جنوبی ایشیاء کے نوجوان یا کہنہ مشق افسانہ نگاروں نے بوجوہ مغربی ممالک کا سفر اختیار کیا۔ مغربی ادب کے بھرپور مطالعے سے بھی اردو افسانہ نگاروں کے ہاں یہ مغربی جہت نمایاں ہوتی رہی۔ خصوصاً ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں کی ایک قابل لحاظ تعداد نے مغربی

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

ممالک کا یا تو براہ راست مشاہدہ کیا یا وہاں کے ادب کے ذریعے مغربی طرزِ زیست کو سمجھا اور اس مشاہدے یا تجربے کو روایتی مشرقی احساس سے ملا کر افسانے تخلیق کئے۔ امثلاً اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم کے افسانے زیادہ تر ترکی ادب سے ماخوذ ہیں اور ترکی یورپ اور ایشیاء کی سرحد پر واقع نیم مغربی مشرقی ملک ہے۔ اسی طرح اعجاز حسین بٹالوی کے افسانوں میں مغربی طرز زیست کی جھلک بہت نمایاں ہے اور انہوں نے لندن، پیرس، لاس اینجلس وغیرہ کے بارے میں پر تاثر افسانے لکھے ہیں۔

مغرب میں اردو افسانہ نگاری کی دوسری جہت، وہاں رہنے بسنے والے اردو افسانہ نگاروں کے افسانوی ادب سے تشکیل پاتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اردو افسانہ نگار بڑی تعداد میں آباد ہیں جن میں قیصر تمکین، رضا علی عابدی، محمد عمر میمن، مقصود الٰہی شیخ، خالد سہیل، مصطفی کریم، منیر الدین احمد، ہرچرن چاولہ، جتندر بلو، آغا سعید، عمر حیات اور افتخار نسیم کے نام نمایاں ہیں۔ ادھر خواتین افسانہ نگاروں میں شاہدہ احمد، بانو ارشد، محسنہ جیلانی، ڈاکٹر فیروز مکرجی، رضیہ فصیح احمد، صفیہ صدیقی، حمیدہ معین رضوی، فیروزہ جعفر اور نعیمہ ضیاء الدین کے نام بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

مغرب کے اردو افسانوں کا جائزہ یہ بتاتا ہے کہ مغربی اردو افسانے کا زیادہ تر تعلق کہانی پن سے جڑا رہا ہے۔ پاکستان میں خصوصاً اور اردو افسانہ نگاری میں عمومی لحاظ سے ۱۹۶۰ء کے بعد علامت نگاری کا خاصا چرچا تھا۔ مغرب کا اردو افسانہ البتہ اس تحریک سے خاطر خواہ حد تک متاثر نہیں ہوا۔ چند ایک افسانہ نگاروں مثلاً قیصر تمکین، محمد عمر میمن، جتندر بلو اور عمر حیات نے علامت نگاری کی تکنیک استعمال کی ہے۔ علامت نگاری کے زیادہ مقبول نہ ہونے کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ مغرب میں آزادی اظہار پر ایسی پابندیاں نہیں تھیں جیسی پاکستانی افسانہ نگاروں نے خاص طور پر برداشت کیں۔ لہٰذا مغرب میں علامتی افسانہ لکھنا، مجبوری کے باعث نہ تھا بلکہ جس افسانہ نگار کو علامت نگاری اپنی افتادِ طبع سے قریب تر محسوس ہوئی اس نے اظہار کی خاطر اس تکنیک کو اپنا لیا۔

مغرب میں اردو افسانے کا کم و بیش تعلق کہانی ہی سے جڑا ہوا ہے اور بہت حد تک اس افسانے کا ایک براہ راست تعلق جنوبی ایشیاء کے افسانے سے بھی ہے۔ ایک تو زبان کی وجہ سے یہ تعلق مزید گہرا ہوا، پھر یہ بھی ہے کہ اکثر افسانہ نگار تہذیبی اور ثقافتی سطح پر اپنے آبائی وطن ہی کو اپنی شناخت کا نشان سمجھتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح اپنی پہچان سے تعلق رکھنے کی یہ خواہش ان کے افسانوں میں بھی راہ پا جاتی ہے۔

مغرب میں لکھے جانے والے اردو افسانے پاکستان کی سیاسی اور سماجی فضا پر بھرپور تبصرہ ہیں، جو بعض اوقات طنز کی صورت بھی اختیار کر جاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مغرب کا اردو افسانہ، کئی پہلوؤں سے، جنوبی ایشیا کے اردو

افسانے سے مختلف ہے۔ مثلاً مغرب کے اردو افسانے کے کردار اور کہانیاں صرف پاکستانی اور ہندوستانی معاشرے سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ یہ کردار اور کہانیاں یورپ، کینیڈا، امریکہ اور افریقہ تک بھی پھیلی ہوئی ہیں۔

چونکہ یہ افسانہ نگار بالعموم ایک کثیر الثقافتی معاشرے کے باسی ہیں اس لیے ان کے افسانوں کا ثقافتی ماحول، کرداروں کا رنگ، نسل، زبان اور وطن بھی، جنوبی ایشیا کے افسانوں سے بہت حد تک مختلف ہے۔ ان افسانوں میں ایک عالمی منظر نامہ ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس افسانے کے بنیادی موضوعات میں سرحدوں کو قریب لانے، ثقافتی رکاوٹیں کم یا ختم کرنے، میڈیا کا کردار، عالمگیریت کے اثرات، مغرب میں پیدا ہونے اور جوان ہونے والی نسل کے مسائل، ذہنی اور نفسیاتی الجھنیں، سیاسی پناہ وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری مغرب کے اردو افسانے کے موضوعات پر لکھتے ہیں:

> "جہاں تک مغربی افسانے کے موضوعات کا تعلق ہے۔ اس افسانے کے موضوعات خاصے وسیع ہیں۔ نسلی امتیاز، جڑوں کی تلاش، تہذیبی تصادم، جنریشن گیپ، نئی علمی تحریکوں سے وابستگی کی آرزو، جنس، مخلوط شادیاں، شخصی آزادی، وطن نگاری، ہجرت، مذہب سے وابستگی، غریب الوطنی، انسان دوستی اور تنہائی و بیگانگی جیسے موضوعات سے مغرب کے اردو افسانے نے خصوصی شغف کا اظہار کرتے ہوئے مشرق و مغرب کی زندگی اور انسان کے باطن کو کھنگالنے کی قابل قدر کوششیں کی ہیں۔" **(۱)**

مغرب میں اردو افسانہ نگاروں کی تعداد سرعت سے بڑھ رہی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سبھی افسانہ نگار کامیاب ثابت نہیں ہوتے ہیں۔ اکثر افسانوں میں افسانوی تکنیک کا فقدان نظر آتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اکثر افسانوں کا بیاں رواں اور زبان عمدہ نہیں ہے، جس سے افسانہ پڑھتے ہوئے اجنبیت اور رکاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ بہر حال مغرب میں کئی ایسے اردو افسانے بھی لکھے گئے ہیں جو افسانہ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

مغرب میں اردو زبان اور ادب کی ترویج کے لئے محمد عمر میمن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی بنیادی حیثیت مترجم کی ہے۔ ان کے ترجمے تواتر کے ساتھ مختلف ادبی رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ ''دی اینول آف اردو سٹڈیز'' کے مدیر کی حیثیت سے بھی وہ اہم خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''تاریک گلی'' منظر عام پر آچکا ہے۔ اس افسانوی مجموعے کی کہانیاں خواب اور حقیقت کے دھندلکوں کے درمیان گردش کرتی ہیں۔ اپنے مجموعے کے آغاز ہی میں محمد عمر میمن نے میلان کنڈیرا کا ایک اقتباس درج کر کے، اپنی کہانیوں کی نوعیت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں اساطیری کرداری روایت کی نمو ملتی ہے۔ امریکہ میں مقیم اس افسانہ نگار کی کہانیاں بین الثقافتی (Multicultural) تنوع کی حامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں مغربی انداز ذہنیت، تعلیمی

اداروں کا ماحول، مشرقی اور مغربی خیالات کے ٹکراؤ کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

میمن کا افسانہ "چاندنی اور کھمبیاں" اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ اوامر اور مظاہر کی لایعنیت، عدم شناخت اور اقدار کی پامالی صرف مشرق ہی کا نہیں، مغرب کا بھی المیہ ہے۔ یوڈتھ، عربی پڑھنے کی مشتاق ہے اور مترجم بننا چاہتی ہے۔ وہ یونیورسٹی اساتذہ سے نالاں ہے۔ اسے یوسف نقاش کے رویوں میں مشرقی جذباتیت نظر آتی ہے اور وہ سستی اور سطحی خواہشوں میں گھر کے رہ جاتی ہے۔ اس کہانی میں معاشرتی جذباتی مسائل اور الجھنیں، زیریں لہر کے طور پر رواں رہتی ہیں:

> "مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے۔۔۔ کہ میری طرح تمہارا جھگڑا بھی اپنی ذات ہی سے ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں نے شاید اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی اداسی کو انٹرنلائز کر لیا ہے اور تم ابھی اداسی سے تنہائی کی طرف اپنے سفر کی پہلی منزل میں ہو اور اسی لئے تم اپنی ذات میں نہایت مضطرب ہو، دکھی ہو، بکھری ہوئی ہو۔۔۔ ہے نا۔ ان باتوں کے علاوہ میں ہراساں بھی ہوں۔ لیکن کیوں؟ کس چیز سے؟ بس یہی تو ساری مصیبت ہے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا۔ کوئی چیز ہے جو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے، سائے کی طرح میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ بے خوابی اور بد خوابی۔ ان دنوں یہی میری زندگی ہے۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ لوگ، جگہیں، تماشے، ہنگامے غرض یہ سارا ہلا گلا۔ اسی چکر میں دو ایک ڈرگز بھی آزما ڈالیں۔" **(۲)**

مشرق ہو یا مغرب انسان لاحاصلی کے احساس سے بھاگ نہیں سکتا۔ اس کے پاس اپنے لئے کوئی لمحہ نہیں۔ تیز رفتار، مادی ترقی کی دوڑ میں جدید خاندانی نظام، محبت اور تعلق کی لطافت سے محروم ہو چکا ہے۔ ذمہ داریوں اور توقعات کا بوجھ انسان کو پیس ڈالتا ہے اور بالآخر وہ چیخ اٹھتا ہے:

> "۔۔۔ میں عاجز آچکا ہوں یہ چھکڑ بھر متعفن امیدیں اور توقعات جو انہوں نے نہایت بے شرمی کے ساتھ مجھ سے وابستہ کر رکھی ہیں! ملک، افراد، قوم، رشتے دار الگ، دوست احباب الگ اور آخر آیہ بیوی اور ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا بچہ۔۔۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ان سب کا حساب چکاتے چکاتے میرا اپنا لمحہ کبھی نہ آسکے گا۔ چاہیے کہ آدمی بھاگ جائے۔۔۔ کام کرنے کے لئے، کچھ بننے کے لئے۔ بے درد ہونا ضروری ہے۔۔۔۔" **(۳)**

اس افسانے میں وطن کی طرف مراجعت کی خواہش بھی نمایاں ہے:

> "تم یہودی ہو نا؟ اسرائیل چلی جاؤ۔ وہاں تم پر مملیت کا دورہ نہیں پڑ سکے گا۔۔۔ خواہ لاکھ

پر آشوب سہی، اسی تناسب سے نہایت بامعنی بھی ہوتے ہیں۔۔۔ جس سے انہماک، مثبت زندگی اور ان والومینٹ کا عجیب آسودگی بخش احساس جنم لیتا ہے۔" (۴)

"چاندنی اور کھمبیاں" کی کہانی، یونیورسٹی کے ریکریشن ہال میں گزاری گئی ایک شام کی کہانی ہے۔ جہاں دلوں کے خوف اور اضطراب پر علمیت کی قلعی چڑھائے ہوئے چہرے ہیں۔ یوڈتھ جو یہودی ہے اور اسرائیل سے دور بھی۔ وہ مشرقی یہودیوں سے متنفر ہے لیکن اس امر کو شعوری سطح پر مانتی نہیں ہے۔ وہ ایک ننھی بچی ہے جو بالغوں کی دنیا میں کھو گئی ہے۔ بہجت کا تعلق ایران کے طبقہ اشرافیہ سے ہے۔ کئی زبانیں روانی سے بول سکتی ہے اور بہت سی کتابیں پڑھ چکی ہے لیکن یہ علمیت، فیشن اور رعب جھاڑنے کے سوااور کچھ نہیں۔ ہر وقت "سٹینڈر" کے لڑکے نہ ملنے کا رونا روتی ہے لیکن جب کوئی شادی کاارادہ ظاہر کرے تو شادی کے ارادے ہی کے خلاف ہو جاتی ہے۔ یہ اور ایسے کئی کردار انسانی منافقت کی پردہ دری کرتے ہیں اور اس افسانے کو معیاری اور بھرپور بنادیتے ہیں۔ میمن کے افسانے "واپسی" کی بنیادیں حضرت نوح کے قصے پر استوار کی گئی ہیں۔ میمن نے علامتی انداز میں، ہزاروں سال پہلے کے قصے کا تعلق آج کی عصری صورتِ حال سے جوڑ دیا ہے۔

میمن کاافسانہ "تاریک گلی" کراچی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار مولوی محمد اظہر ہیں جو درمیانی طبقے سے تعلق رکھنے والے ادھیڑ عمر انسان ہیں۔ اس افسانے میں میمن نے نوجوان نسل کی مذہب سے برگشتگی کو بھی موضوع بنایا ہے:

"۔۔۔ مذہب بری چیز نہیں، لیکن بعض اوقات اس کے اتباع سے افعال اور افکار میں بندھی ٹکی یکسانیت آجاتی ہے، جس سے اعمال کی خالص روح مر جاتی ہے۔۔۔ پھر یہ کہ آئے دن اخباروں میں، مسجد کے حجروں کی گھناؤنی فضا میں، برگزیدگان کے کارہائے نمایاں سے ترتیب پانے والی سرخیوں نے، اسے مذہب سے قدرے برگشتہ کر دیا تھا۔۔۔ اسے تو رشتے کے ایک بڑے میاں سے بھی صرف اسی بات پر کچھ کد سی تھی کہ یوں تو وہ پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرنے کے عادی تھے اور اکثر سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے راہ راست پر چلنے کی تلقین فرماتے رہتے تھے لیکن راہ چلتی عورتوں پر نظریں گاڑنے کو بھی اپنے فرائض یومیہ میں داخل شمار کرتے تھے۔ پھر موصوف نے اپنے ڈاکٹر سپوت کو رشوت ستانی سے کبھی نہ روکا تھا۔ اب اگر مذہب سے چمٹ کر بھی وہی سب کرنا ہے جو شیوہ لادینیت ہے تو پھر لامذہب رہنا ہی کیا بُرا ہے۔" (۵)

مولوی صاحب کی پانچ مہینے کی بچی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس بچی کی تعزیت کے لئے آنے والے لوگوں کی حرکات و سکنات اور گفتگو، ان کے رویوں کا دوغلہ پن، باطنی خباثت اور ظاہر داری، انسانی بے حسی اور گھٹیا ذہنیت ان سب کو بیان کرتا ہوا یہ ایک پر تاثیر افسانہ ہے:

"۔۔۔ اس روشنی میں اسے چند پیکر نظر آئے۔ جن کے کندھوں پر ایک جنازہ تھا اور قدموں میں پارے کا سا اضطراب لئے وہ بس چلے جا رہے تھے۔ کہاں؟ یہ ان میں سے کسی کو معلوم نہ تھا۔ ان کے چہروں سے ارادے کی کمی اور برہمی کا تاثر مترشح تھا۔ وہ جلد از جلد اپنا بوجھ اتار پھینکنے کے درپے تھے۔ لیکن ان کی آنکھیں دیکھنے سے، اپنی منزل کی شناخت سے معذور تھیں۔ یا شاید اس نے جس نے ان کی آزادی سلب کی تھی، اس لازوال اندھیرے میں ساری عمر سر مارنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔" **(۶)**

"کینچوا اور سورج مکھی: علامتی کہانی ہے۔ کالی، پیلی اور سفید ٹانگ، دنیا کے کالے، پیلے اور سفید فام لوگوں کو ظاہر کرتی ہے۔ نسلی تفاوت اور رنگ کی بنیاد پر اقوام کی تقسیم کو علامتی پیرائے میں بیان کرتا ہوا یہ ایک اچھا افسانہ ہے:

"اس کی مایوس نظر اپنی ٹانگوں پر جا پڑی۔ تینوں مزے سے پڑی سوئی تھیں۔ سب سے پہلے سفید چت ہوئی تھی۔ موٹر، جہاز، ڈش واشر، ریل، غرض کیسی ہی آواز ہو، سنتے ہی یہ وجد میں آجاتی اور پتا بھی نہ چلتا کب سحر زدگی میں اسے نیند آگئی۔ پیلی ٹانگ ادھر شہر کے شمالی سرے پر ریشمیں سبز کنوگا پہاڑوں کے دامن میں، کنکالوجی مندر کے لازماں حسن کا تصور کرتی ادھر پٹ سے بے جان مچھلی کی طرح ساکت ہو جاتی۔ ایک کالی ٹانگ ہی ایسی تھی جس کم خوابی کی عام شکایت تھی۔ پڑے پڑے پہروں سوچا کرتی کہ ٹویوٹا اور تصوف میں کیا تعلق ہے۔" **(۷)**

کالجوں میں لڑکیوں کی خبر گیری کے لئے جو عورت رکھی جاتی ہے، اس کے کردار کو مرکز بنا کر محمد عمر میمن نے ایک خوبصورت افسانہ "ماسی" لکھا ہے۔ کالج کی زندگی، لڑکیوں کی ناآسودہ دبی ہوئی خواہشات، جنسی تشنگی، روایتی پیار محبت کی گھاتیں، سستا اور بازاری عشق، لمحے بھر کی خوشی اور ان سب میں ماسی کا تعاون، اس افسانے کی بنت میں سمویا ہوا ہے۔ "تاب نظارہ نہیں" اور "بجلی بسنت" بھی محمد عمر میمن کی اچھی کہانیاں ہیں۔ "تاب نظارہ نہیں" یونیورسٹی طلباء کی سطحی ذہنیت پر لکھی جانے والی عمدہ کہانی ہے:

"دو سال اگر D. R کا انتخاب لڑا تھا تو اس لئے نہیں کہ قوم و ملت کے چٹکتے ہونہاروں

کی خدمت کو مرا جا رہا تھا۔ سارا مقصد یہی تھا کہ اس طرح بلیزر کی پاکٹ اور انسگنیا والی ٹائی مل جائے گی۔ جسے موسم سرما میں زیب تن کر کے میں قدرے تفخر کے ساتھ شانے اچکاتا ہوا یونیورسٹی کے طویل، قطار اندر قطار کوری ڈورز میں یوں اپنے کو بہت مصروف ظاہر کرتے ہوئے چکر لگا سکوں گا۔"(۸)

"بڑا اپدیشک ہے" یہ افسانہ بھی عمومی معاشرتی رویوں پر گہرا طنز ہے۔ مادیت زدہ اس معاشرے میں انسان ہر اس چیز سے خفت زدہ ہو جاتا ہے جو اس کی کم مائیگی ظاہر کرے۔ خواہ وہ کم قیمت خوشبو کی بوتل ہو یا تیسرے درجے کے ٹکٹ گھر کے سامنے کی قطار۔ انسان اپنی مادی کمزوری کی وجہ سے نفسیاتی طور پر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر ساری زندگی اسی احساس سے پیچھا چھڑانے میں مصروف رہتا ہے۔

محمد عمر میمن نے بہت کم کہانیاں لکھی ہیں لیکن ان کے مجموعے "تاریک گلی" کا ہر افسانہ، انسانی زندگی کے کسی نہ کسی رخ کو مہارت سے بیان کرتا ہے۔ اس لیے وہ انسانی صورتِ حال کے ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔

اردو افسانہ نگاری کی مغربی جہت کے ایک اور اہم افسانہ نگار مقصود الٰہی شیخ ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے سے انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ "پتھر کا جگر"، "برف کے آنسو"، "جھوٹ بولتی آنکھیں"، "پلوں کے نیچے بہتا پانی" ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ نے ناولٹ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اب تک ان کے دو ناولٹ "شیشہ ٹوٹ جائے گا" اور "دل ایک بند گلی" چھپ چکے ہیں۔ وہ صحافی بھی رہے ہیں، ان کی ذات کا ایک اہم حوالہ رسالہ "مخزن" کا اجراء ہے جو برطانیہ میں اردو کو متعارف کرانے کے لئے اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ مقصود الٰہی شیخ نے "پوپ کہانیاں" کے نام سے اردو افسانے میں ایک نئی تکنیک متعارف کرانے کی سعی بھی کی ہے۔ یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی، اس کا فیصلہ آئندہ وقت کرے گا۔

مقصود الٰہی شیخ کے زیادہ تر افسانے رومانوی انداز لئے ہوئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مشرقی ثقافت جلوہ ریز ہے۔ ان کے افسانوں کے خاص موضوعات میں ہجرت، سیاسی پناہ، پیپر میرج، عدم شناخت کا مسئلہ، تقسیم ہند، سماجی جبر اور یورپ میں ایشیائیوں کے سطحی رویوں کی عکاسی اہم ہیں۔ "زیست کا دیباچہ" مغرب میں پڑھنے والی ایک مشرقی لڑکے کی محبت کا قصہ ہے۔ اس رومانی قصے میں وہ لکھتے ہیں:

"آج کی سوسائٹی کے ذوق کا پس منظر مشرق ہے اور پیش منظر مغرب۔"(۹)

شاید یہ المیہ مغرب میں رہنے والے ہر مشرقی کا مشترکہ المیہ ہے۔ وطن مراجعت کی طلب بھی ان کے

افسانوں میں نظر آتی ہے:

"لیکن آج اسے وہ گھر کیوں یاد آرہا ہے جو ہزاروں میل کے فاصلے پر ہے۔ جو اس کا تھا، پر نہیں تھا۔ جسے وہ اجنبیوں کی طرح چھوڑ کر چلا آیا۔" (۱۰)

جس طرح گاؤں کے رہائشی کو شہر اپنے خوابوں کی سرزمین نظر آتا ہے اسی طرح چھوٹے ملکوں میں رہنے والے، ترقی یافتہ ممالک کے جگمگاتے شہروں کو اپنی خواہش کی انتہا سمجھتے ہیں اور ہمہ وقت اس منزل کو پانے کی جستجو میں لگے رہتے ہیں:

"اس نے دل مار مار کر لندن کا کرایہ پس انداز کیا۔ ہر طرح کی سختیاں جھیلیں۔ ایک خوبصورت سی امید تھی جو واحد آسرا بنی ہمت بندھاتی رہی۔ لندن اس کے خوابوں کی صبح تھی۔ سات سمندر پار، نئی دنیا، آزاد دنیا، اس کی آخری منزل۔۔۔" (۱۱)

یہ اور بات ہے کہ اپنی منزل پر پہنچ کر ہر مشرقی کو عدم شناخت اور تہ دار منی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ مقصود الٰہی شیخ کی کئی کہانیاں اس احساس سے عبارت ہیں۔

مغرب کے اردو افسانہ نگاروں میں ایک اور اہم نام قیصر تمکین کا ہے۔ قیصر تمکین کا پیشہ تبصرہ نگاری ہے۔ وہ مغربی ادب کے جدید رجحانات سے بخوبی واقف ہیں اور ان کی واقفیت کے اثرات ان کی تحریروں پر جابجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جدیدیت کا پہلو نمایاں ہے۔ ان کے کئی افسانے علامتی اور استعاراتی انداز میں بھی لکھے گئے ہیں مثلاً "صدی کے موڑ پر" اور "شہر زاد سو گئی" طبقاتی شعور، مغرب میں آبادتارکین وطن کو درپیش شناختی بحران، تیسری دنیا کے مسائل، تہذیبی آویزش اور سیاسی جبر، ان کے افسانوں کے اہم موضوعات ہیں۔

"خاکستر" کلرک کی زندگی پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ دیو کی نندن بابو پچپن برس کی عمر میں کلرکی سے ریٹائر کر دیے گئے اور ان کا ہیڈ کلرکی کا خواب تشنہ ہی رہ گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کا خالی پن اور بے مصرف زندگی، دیو کی نندن بابو کو بوکھلا دیتی ہے اور وہ بلا مقصد شہر بھر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگتے ہیں۔ اس آوارہ گردی میں وہ شہری سماج کے مختلف پہلوؤں کو دیکھتے ہیں، اور یوں ان کے ساتھ ساتھ قاری بھی سماج کی گھناؤنی صورتوں سے شناسائی حاصل کر لیتا ہے:

"۔۔۔ آخری بار جب ان کی ٹانگیں اس عورت کے شانوں سے ٹکرا گئیں تو وہ سہم گئے، ساری عزت خاک میں ملنے کا خطرہ منڈلاتا نظر آیا۔ انہوں نے اس عورت پر نظر ڈالی مگر وہ منہ دوسری طرف کر کے زیر لب مسکرائی۔ ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ بھگوان جانے کیا چکر ہے معلوم ہوتا ہے یہ خود جان بوجھ کر مجھ سے ٹکرا رہی ہے۔" (۱۲)

"خاکستر" اخلاقی لحاظ سے زوال آمادہ شہری سماج میں فحاشی اور جنسی بے راہ روی کی عام مثالوں سے کسی روایت پرست شخص کی تلخی، جھنجھلاہٹ، غصہ، احساس بے بسی اور بوکھلاہٹ پر مبنی افسانہ ہے۔ اس افسانے میں طوائفیت کا ایک نیا پہلو پیش کیا گیا۔ جسم فروشی کا کاروبار، عام متوسط طبقے کی زندگی میں بھی شروع ہو چکا ہے اور "گلاب" جیسی عورتیں بھی سامنے آتی ہیں جو کسی پہلو سے طوائف نہیں لگتیں۔ "ہولی فیملی" مشرق کے اسی انہدام کا مغربی رخ ہے:

> "۔۔۔ مسز میتھیوز مجھ کو بالکل نادان بچہ سمجھتی ہے۔ بڑی قابلیت بگھارتی ہے اور آخر میں یہی کہتی ہے۔ سب کچھ فریب ہے۔ فریب محض، چھایا، کوئی چیز قابل اعتبار نہیں۔ فرانسیسی طرز کے مصنوعی عضو تناسل اور ایک خاص قسم کے فرنچ لیدر کی فراوانی کے دور میں پاکیزگی کا تصور غیر ضروری ہے۔" **(۱۳)**

"اعتراف" فادر پارسن کی کہانی ہے جو دور دراز کے ایشیائی ممالک سے تبدیل ہو کر مغرب میں آ بسا ہے۔ مطالعے کا شیدائی ہے۔ لوگوں میں اس کی علمی قابلیت اور خطابت کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مجید گناہوں کے بوجھ، بھوک اور زندگی کی بے معنویت سے بے زار ہو کر اس کے پاس آتا ہے اور اعتراف کرنا چاہتا ہے:

> "۔۔۔ اف یہ ایشیائی بھوک کہاں کہاں چھپی بیٹھی ہے۔ یہ نوجوان اور خوبصورت لڑکا جو لاکھوں کام کر سکتا ہے اور اس دنیا کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں چھوٹا موٹا حصہ لے سکتا ہے۔ محض اس وجہ سے خودکشی پر آمادہ ہے کہ بھوک کا عفریت اس کو بھی اپنی زد میں لیے بیٹھا ہے۔ اس کو ایسا لگا جیسے پورے ایشیا میں بھوک ایک کینسر کی صورت چھپی بیٹھی ہے۔" **(۱۴)**

مجید، مشرق کا وہ آسودہ نوجوان ہے جو اپنی جڑوں سے کٹ کر، مغرب کی رعنائیوں اور جگمگاتی روشنیوں میں اپنے حصے کا رزق ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس سعئ رائیگاں کے نتیجے میں، وہ عدم شناخت اور تہذیبی مغائرت کا شکار ہو چکا ہے۔ تیز رفتار معاشرے کی بھاگ دوڑ اسے انسانی سطح سے بھی گرا دیتی ہے لیکن اس کے اندر کی مشرقی روح، اسے بے چین رکھتی ہے اور بالآخر وہ اعتراف کرنے فادر پارسن کے پاس آ جاتا ہے۔ اس کہانی کا یہ نکتہ بھی معنی خیز ہے۔ آخر ایک مسلمان لڑکا، عیسائی طریقے پر کیوں چلنا چاہتا ہے۔ کیا مغربی معاشرے میں اسلام کے بنیادی اصولوں کی پرواہ نہیں رہی۔ یا اس کا اعتقاد کمزور پڑ چکا ہے۔ یا وہ ثقافتی اور مذہبی بھیڑ چال کا شکار ہو چکا ہے۔ کیا ایسا تو نہیں کہ یہ فعل اس کی بغاوت کا بھی اعلان ہے؟ یا یوں ہے کہ اس جدید معاشرے میں اس کے پاس کوئی دوست نہیں، جس سے وہ اپنے دل کا حال کہہ سکے تو وہ ہم راز اور عمر گسار کی تلاش میں فادر پارسن کے پاس آ گیا ہے۔ یہ افسانہ قاری کے ذہن میں ایسے کئی سوالات اٹھاتا ہے جو اس افسانے کی کامیابی کی دلیل ہے:

"سواستکا" کا پس منظر اٹلی کا شہر وی آنا ہے اس افسانے کا یہ جملہ بہت معنی خیز ہے:

"یہ دور ارزل ترین مخلوق کے عروج کا دور ہے۔" **(۱۵)**

"چراغ تلے" مغربی معاشرے میں مشرقی باشندوں کے مسائل پر ایک عمدہ تحریر ہے۔ مغرب میں مشرقیوں کے لیے بڑھتا ہوا غصہ اور تشدد، اس افسانے میں نمایاں طور پر بیان ہوا ہے۔ مغربی معاشرے کی اندرونی کمزوری، کھوکھلا پن، جرائم اور جنسی آزادی بھی اس افسانے میں عکس ریز ہے۔ مسز ہاپکنس کے پاس رقم کی موجودگی کی اطلاع نائج، نک، فرڈ اور جیکی کو ہو جاتی ہے تو وہ اسے لوٹنے کا منصوبہ بناتے ہیں اور پرانے علاقے کے متروک بنک کی خستہ حال عمارت کے قریب اسے لوٹ کر، پیچ در پیچ گلیوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ اس لوٹ مار سے پہلے یہ تینوں سفید فام نوجوان اپنے چہرے کی رنگت تبدیل کر کے سیاہ فام بن جاتے ہیں تاکہ لوٹ مار کا الزام سیاہ فاموں کے ذمے آئے۔ یہ مغرب کی نوجوان نسل کے نمائندے ہیں جن کے لئے جرم کا تصور بدل چکا ہے۔ وہ محض چند سکوں کی خاطر کسی کو قتل تک کر سکتے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں اپنی عصمت کا باآسانی سودا کر سکتی ہیں کیونکہ یہاں ہر چیز بکاؤ ہے اور ہر مال کی ایک قیمت ہے۔ اپنے مال کی قیمت وصول کرو اور بن پڑے تو دوسروں سے چھین لو۔ یہ نئے معاشرے کا اصول زندگی ہے۔ انفرادی سے اجتماعی سطح پر یہی اصول کار فرما ہے۔ نسل پرستی اور احساس برتری مغربی معاشرے میں سرایت کر چکی ہے اور وہ ہر قیمت پر رنگدار اقوام کے افرد کو اپنے ملک سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہی رویہ ہے جو جنوبی ایشیا کے نوآبادیاتی دور میں بہت واضح رہا ہے۔ تشدد اس معاشرے کا لازمی عنصر بن چکا ہے۔ قیصر تمکین کا یہ افسانہ مغربی معاشرے کی عمدہ عکاسی ہے۔ شمسل جو ایک بنگالی ہے اور پہلے ہی تشدد، غصے اور نفرت کا شکار ہے، اس کیس میں دھر لیا جاتا ہے۔ مغربی پولیس کی روایتی تیزی، طراری اور چابکدستی بھی نسل پرستی کی دھند میں ماند پڑ جاتی ہے اور وہ اسی شخص کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتے ہیں۔ جب کہ:

> "۔۔۔ یہ آدمی وہی تھا جس کے گھر میں آگ لگانے کی کوشش کی جا چکی تھی۔ جس کے گھر کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے گئے تھے اور کیا پتہ کہ کھنڈاریا اور دھن راج اس کی حراست کو پولیس کی انتقامی کاروائی قرار دے کر بائیں بازو کے انتہا پسندوں کے لئے کوئی دلچسپ مشغلہ فراہم کر دیں۔" **(۱۶)**

پولیس تو شمسل کو چھوڑ دیتی ہے لیکن دریں خانہ وہ ہیرو پی سی وائی جونز اور ہیرو پی سی ڈرنک واٹر کو سمجھاتی ہے کہ کالوں کی گوشمالی کا یہ اچھا موقع ہے۔ سفید فام مہذب قوم کے نمائندے یہ اعلیٰ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے

اور شمسل آخیر کار اخباری خبر اور نسل پرستی کے خلاف ٹیلی ویژن کے مباحثے کا عنوان بن کر رہ جاتا ہے۔ ''چراغ تلے'' قیصر تمکین کے اہم افسانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے جو مغربی معاشرے کا عمدہ بیان ہے۔

قیصر تمکین کا افسانہ "ایک کہانی، گنگا جمنی" برصغیر کے معاشرے کا عکاس ہے۔ برصغیر میں ہندو اور مسلمان عرصہ دراز سے آباد ہیں اور دونوں اقوام میں فسادات بھی کوئی نیا مظہر نہیں ہیں۔ قیصر تمکین کا یہ افسانہ، اس حقیقت کا بھی مظہر ہے کہ بڑے بڑے فسادات کا نقطۂ آغاز بالعموم کوئی نہایت معمولی واقعہ ہی ثابت ہوتا ہے۔ کسی کا غصے سے بھرا کوئی جملہ، یا کوئی جذباتی لغزش۔ لیکن انسانوں کی انفرادی کمینگیاں، غصے، جذباتی ابال اور نفرتیں، ذرا سی بات کو پھیلا کر فساد کی ایسی آگ بھڑکا دیتی ہیں کہ کئی گھرانے اس آگ میں جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں۔ مرزا بیدار بخت کے محلے میں فساد بھڑک اٹھنے کی وجہ یہ تھی کہ بیدار بخت کسی نامعلوم چھوکرے کی مستی بھری تان سن کر غصے میں آ گئے تھے اور انہوں نے اپنے گھر سے باہر نکل کر اس نامعلوم شوخ کو مزہ چکھانے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ شخص نہ ملا تو ان کے غصے کا نشانہ، وہ بندر بن گیا جو ہر راہ گیر کے لیے تکلیف کا باعث تھا۔ محلے کے ہندوؤں نے بندر کی موت کو مذہبی مسئلہ بنالیا اور یوں گروہ کے گروہ اس مذہبی جنگ میں شامل ہوتے گئے جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس افسانے میں ہمیں ہندوستان کے گنگا جمنی معاشرے کی منظر کشی نظر آتی ہے:

> "چاندنی والی گلی میں حسب معمولی صبح کا شور شرابہ دوپہر سے گلے مل رہا تھا۔ قلعی گر برتنوں پر رانگے کے چمکتے چھلوں سے قلعی کرنے میں مصروف تھا۔ نیچی نیچی چھتوں والی اندھیری دکانوں میں پتنگ بنانے والے اپنے فن کو آخری سنبھالا دینے کی کوشش میں مصروف تھے۔ گلی کے برابر محلسرا کی لکھوری اینٹوں کی دیوار پر کھونٹیاں، اور چرخیاں لگا کر کنکوؤں کے لیے ڈور اور مانجھا بنایا جارہا تھا۔ میونسپلٹی کے موٹی دھار۔۔۔ پر حافظ بشیر کی بیوہ ترکاریوں کا ڈھیر لگائے ہوئے شلجم دھو رہی تھی۔ بانکے لال کے کریانہ سٹور پر ادھار آٹا، دال مانگنے والی سیدانیاں برقعے اوڑھے، نقاب الٹے، بھاری بھاری کولہوں پر ریں ریں کرتے اور ناک بہاتے بچے ٹکائے طرح طرح کے بہانے بنا رہی تھیں۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں۔۔۔ تار جیسے چاندی کے چھلے، ایک آدھ سونے کی بالی، ناک کی کیل یا کسی ننھی بچی کی چھوٹی سی چوڑی بھی تھی جس کو رہن رکھ کر وہ جو ملا آٹا یا دھان ملے کا کن جیسے چاول لے جانے کی فکر میں تھیں۔" **(۱۷)**

"رضا علی عابدی" لندن میں مقیم ہیں اور اردو افسانہ نگاری میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے

مجموعے "چاند کی تلاش"، "چھوٹی سی بات" اور "جان صاحب" خاصے مقبول ہیں۔ لندن میں رہائش پذیر ہونے کے باوجود ان کے افسانوں کے اکثر کردار پاک وہند سے تعلق رکھتے ہیں۔

"ٹین کا خالی ڈبہ" ایک یاد کی طرح کھلتا ہوا دھیما دھیما سا افسانہ ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جب بھی اپنے سکول کو خواب میں دیکھتا اسے ترقی ہی نظر آتی۔ یہ خواب گویا اس کی باطنی خواہش کا عکس تھا۔ لیکن جب پچیس برس کے بعد وہ اپنے وطن واپس گیا تو اسے یہ دیکھ کر شدید دھچکا لگا کہ ترقی تو ایک طرف، سکول کی رہی سہی عمارت بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ رضا علی عابدی کا افسانہ "دری" عصری صورتِ حال اور بے روزگاری پر گہرا طنز ہے۔ فاروق روزگار کی تلاش میں شہر جانے لگتا ہے تو گاؤں کا بزرگ چودھری رحمت الٰہی اسے مشورہ دیتا ہے کہ وہ ایک دری ضرور اپنے ساتھ لے جائے۔ فاروق کو اس کا یہ مشورہ بہت عجیب محسوس ہوتا ہے لیکن بہر حال وہ دری ساتھ لے لیتا ہے۔ شہر آنے کے کچھ عرصہ بعد اس پر، اس دری کی اہمیت کھلتی ہے کیونکہ یہی دری کبھی اس کا بچھونا بنتی ہے تو کبھی سر کی چھت آخیر میں وہ فٹ پاتھ کے کنارے اسی دری کو بچا کر روزی کمانے کا حیلہ ڈھونڈ لیتا ہے:

> "اگلی صبح اس نے لڑکیوں کے سکول اور دفتر روزگار کے درمیان سڑک کے کنارے دری بچھائی۔ جوتے کے ایک خالی ڈبے کا پیندا نکال کر اس پر ہاتھ کی لکیریں دیکھے جانے کا اعلان لکھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔" **(۱۸)**

"ایک قطار کی کہانی" رضا علی عابدی کا ایک اچھا افسانہ ہے۔ گنجان آبادی اور مادی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے آدمی کا المیہ، اس چھوٹے سے افسانے کا موضوع ہے۔ ایک لمبی قطار ہے۔ سب سے آگے والے مسرور ہیں کہ ان کا نمبر پہلے آجائے گا۔ قطار کے درمیان کھڑے ہوئے افراد چوکس ہیں کہ کوئی قطار کے اگلے سرے میں گھس کر ان کا نمبر پیچھے نہ کر دے اور قطار کے آخر میں کھڑے لوگ مایوس اور تھکے تھکے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ طویل انتظار کے بعد ان کی باری آئے گی۔ لیکن سب سے زیادہ قابل رحم وہ شخص ہے جو قطار کا آخری آدمی ہے۔ جس کے پیچھے ایک شخص بھی نہیں کہ جس پر ترس کھا کر وہ اپنی انا کے دنبے کو خوراک مہیا کر سکے:

> "۔۔۔ جتنے اسباب ہو سکتے تھے ۔۔۔ ہر ایک پر دماغ سوزی کی پر سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ اپنے سے پیچھے والوں کو کیوں دیکھ رہے ہیں۔۔۔ آج بہت عرصے بعد سمجھ میں آیا ہے کہ میں یہ سب کچھ سوچ کر کوئی دوسری سوچ مٹانا چاہ رہا تھا۔ خود میں نے بھی کئی بار مڑ کر پیچھے دیکھا تھا اور دیکھا تھا کہ قطار میں کوئی بھی نیا آدمی نہیں آرہا ہے۔ بہت دیر سے کھڑا آخری آدمی میں ہی ہوں اور مایوسی میں میرا ساجھے دار شاید کوئی نہیں۔" **(۱۹)**

"وہاٹ از یور فادر؟" رحمت مسیح کی کہانی ہے جو شہر کی جیل میں بیک وقت جمعدار ہے اور جلاد بھی۔ وہ اپنے اس فعل سے ناخوش ہے لیکن بہ امر مجبوری، پیٹ کی خاطر وہ یہ کام کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی نفسیات میں گرہیں پڑتی جاتی ہیں۔

افسانہ نگار اور مترجم منیر الدین احمد طویل عرصے سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں مغربی تہذیب کے عیب و ہنر کو چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں کثیر الثقافتی ماحول اور کرداروں کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔ بعض افسانے نفسیاتی پہلو بھی لئے ہوئے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار وسیع النظر اور انسان دوست ہیں۔ منیر الدین احمد چونکہ سفر کے بہت شوقین ہیں شاید اسی لیے ان کے افسانوں میں سفر ناموں کا مزہ بھی ملتا ہے۔ منیر الدین احمد کی کہانیوں میں تخیل اور حقیقت کی آمیزش ہے۔ فاشزِم، مرد کی فیوڈل ذہنیت، تاریخی شعور، زر پرستی، روحانی دیوالیہ پن، فرد کی شکست وریخت، جنسی تلذذ اور انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں سے گریز کا رجحان ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ "زرد ستارہ"، "بنت حرام" اور "بچھڑی کونج" منیر الدین احمد کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔

"جلاوطنی کی قید" ہر اس مشرقی کا المیہ ہے جو مغرب میں جا کر آباد ہو گیا ہو۔ شناخت کا بحران، تنہائی اور شکستگی سے عبارت، یہ ایک عمدہ تحریر ہے۔ مغربی دنیا کے اکثر لوگ یا تو پاکستان کے وجود ہی سے ناواقف ہیں یا اسے ابھی تک ہندوستان کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ یہ امر تلخ سہی لیکن حقیقت ہے۔ اس حقیقت کا اظہار بھی اس افسانے میں ہوا ہے:

> "۔۔۔ پاکستان کا نام انہوں نے سن رکھا تھا مگر نہیں جانتی تھیں کہ وہ ملک کرۂ ارض کے کس خطے میں پایا جاتا ہے۔ ہم نے ہندوستان کے حوالے سے بتانا چاہا، مگر ان کو اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ برصغیر کی تقسیم ہو چکی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں گائے کی پوجا کی جاتی ہے اور سب لوگ مہاتما گاندھی کی طرح دو چادروں میں لپٹے ہوئے آدھا دھڑ ننگا لئے ہوئے گھومتے پھرتے ہیں۔" **(۲۰)**

منیر الدین احمد نے اس افسانے میں ان مشرقی مردوں کا مسئلہ بھی بیان کیا ہے جو مغرب کی کسی عورت سے شادی کرتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں لیکن یہ ثقافتی تفاوت ساری عمر اس خاندان کے درمیان کبھی محسوس اور کبھی نامحسوس طریقے سے موجود رہتا ہے۔ یہ افسانہ مرد کی فیوڈل ذہنیت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

"بچھڑی ہوئی کونج" سوویت یونین کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ لیکن یہ افسانہ کم اور سفر نامہ زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ "فاطمہ" ایتھوپیا پر لکھی گئی کہانی ہے۔ ادریس ابابا کی نیم تاریک گلیوں کے کونے پہ ملنے والی لڑکی دراصل ایک طوائف ہے جو یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ہے اور کئی زبانیں جانتی ہے۔ ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے وہ عصمت

فروشی کرنے لگی ہے اور اس کو باعثِ عار نہیں سمجھتی۔ حبشہ کی خانہ جنگی، بھوک، اشتراکیت کی تبلیغ، نقل و حرکت پر پابندی، معیشت کی تباہی، ریستورانوں کی تباہ حالی اور عدم تحفظ کے احساس سے یہ کہانی بنی گئی ہے۔

انگلینڈ میں مقیم جتندر بلو کی پیدائش پشاور میں ہوئی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ دہلی چلے گئے۔ بعد ازاں انہوں نے انگلینڈ کو اپنا مسکن بنایا۔ مغرب میں رہنے والے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح جتندر بلو کے افسانوں میں بھی مشرق و مغرب کی کشمکش نظر آتی ہے۔ نسلی امتیاز، محبت اور فلرٹیشن، شخصی آزادی کی جدوجہد، عورت شناسی، شناخت کا بحران اور جنس، جتندر بلو کے عمومی موضوعات ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "پرائی دھرتی، اپنے لوگ"، "پہچان کی نوک پر"، "مہانگر"، "جزیرہ"، "نئے دیس میں"، "وشواس گھات" اور "چکر" شامل ہیں۔ "بچھڑتی دھوپ" اس باپ کے خوف کی کہانی ہے جو مادی آسائش کے لالچ میں مشرق چھوڑ کر مغرب میں آبسا ہے لیکن اب وہ اپنی جوان ہوتی ہوئی بیٹی کی عصمت کے لیے پریشان ہے۔ اس کے مشرقی ذہن میں عزت، حیا اور شرم کے جو معنی ہیں، وہ اس مغربی معاشرے میں فرسودہ اور گھسے پٹے ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی سمی کو جدید مغربی معاشرے کا حصہ بننے کی اجازت تو دے دیتا ہے لیکن خود اس کے اندر خوف کا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا رہتا ہے اور اس کے کندھوں اور دل کا بوجھ رفتہ رفتہ بڑھتا چلا جاتا ہے:

> "۔۔۔ تقریباً ہر ویک اینڈ پر سمی کا اپنے فرینڈز کے ساتھ، جن میں زیادہ تر انگلش لڑکے لڑکیاں ہیں کوئی نہ کوئی پروگرام ضرور رہتا ہے۔ کبھی ڈسکو، کبھی میوزیکل نائٹ، کبھی برتھ ڈے پارٹی، کبھی ڈرنک پارٹی، کبھی لیٹریری سیشن، کبھی لیٹ نائٹ فلم شو اور کبھی لائنگ ڈرائیو۔۔۔ اور مجھے جبراً اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے جوں جوں رات آگے بڑھتی ہے توں توں میرا خوف بھی بڑھتا ہے۔" **(۲۱)**

یہ، خود اختیاری جلاوطنی کا لازمی نتیجہ ہے جو ایشیائی والدین بھگتنے پر مجبور ہیں۔ نئی نسل جو مغرب میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی، مشرق سے گہرا واسطہ محسوس نہیں کرتی جب کہ پرانی نسل کے لوگ ہمیشہ وطن مراجعت کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک اہم افسانہ ہے۔ جتندر بلو کا افسانہ "مونگرل" مغربی پس منظر رکھتا ہے۔ چارلی اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ چارلی کا باپ رنگدار جب کہ ماں سفید فام تھی۔ اس لئے وہ دوغلی نسل کا فرد کہلایا جاتا تھا۔ اس کا رنگ اور باپ سے چرائے ہوئے نقش و نگار، اس کے لیے ہر جگہ احساسِ کمتری کی وجہ بنتے رہے تھے۔ یہ افسانہ نسلی امتیاز اور احساس محرومیت کا افسانہ ہے۔ چارلی کی کہانی کلکتہ سے شروع ہوتی ہے۔ وہ کلکتہ جو تقسیم سے پہلے انگریزوں کے لیے جنت نظیر خطہ تھا اور انگریز اس شہر میں حکمرانوں کی طرح رہتے تھے۔ بڑے بڑے، کھلے، طبقہ اشرافیہ کی تمام

سہولتوں سے مزین یہ گھر نوکروں بلکہ غلاموں سے بھرے رہتے۔ وہ کلکتہ جہاں، انگریز اپنی محکوم قوم کے بدن، جذبات اور مجبوریوں سے کھیلتے تھے۔ پھر حالات بدلنے لگے۔ آزادی کی تحریک، تحریک خلافت، ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک، کتنی تحریکیں تھیں جو پھوٹ پڑی تھیں۔ انڈیا میں بدامنی، انتشار اور ہولناکی پھیل گئی تھی اور پھر ایک دن انگریزوں کو اپنا طمطراق چھوڑ کر وہاں سے واپس جانا پڑا تھا۔ چارلی کے والدین کا آپسی تعلق اسی زمانے کی یادگار تھا۔ لیکن شدید احساس برتری میں مبتلا مغربی معاشرہ تہذیبوں، ثقافتوں اور نسلوں کے اس ملاپ کو برداشت نہ کر پایا تھا اور چارلی کے ماں باپ کو علیحدہ ہونا پڑا تھا۔ "مونگرل" نسلی امتیاز پر لکھا گیا افسانہ ہے لیکن افسانہ کا بیانیہ طویل اور بہت کمزور ہے۔ اس لیے اس افسانے کا تاثر مستحکم نہیں ہو پاتا:

> "انہیں دنوں انڈیا اور پاکستان سے ہزاروں کی تعداد میں ایمگرینٹس یہاں چلے آرہے تھے۔ ایک باڑھ تھی جو روکے نہیں رکتی تھی۔ نسلی تناؤ بڑھ رہا تھا۔ فضا میں کشیدگی تھی۔ پہلے امیگریشن ایکٹ کے عمل میں آنے تک کامن ویلتھ کے تمام شہری بلا کسی روک ٹوک کے داخل ہو سکتے تھے اور بھاری رقم خرچ کر کے پاسپورٹ بنوا رہے تھے۔ مقامی لوگ سخت پریشان تھے۔ میڈیا اس موضوع کو خوب اچھال رہا تھا اور نفرت کی لہر قومی سطح پر پھیل چکی تھی۔" **(۲۲)**

"ٹھکانا" بھی جنریشن گیپ کی کہانی ہے۔

> "پدما کے والدین بھی اپنی بیٹی کی طرز زندگی اور اس کے رویوں کے آگے جھک گئے۔ پدما ان شرائط پر گھر لوٹ آئی کہ آئندہ کوئی اس کی ذاتی زندگی میں دخل نہیں دے گا۔" **(۲۳)**

"چھلاوہ" کی ساوتری سمجھتی ہے کہ اس کی پوجا اور دعاؤں کے کارن، اس کے پتی کو یورپ جانے کا موقع ملا ہے اور اب معاشرے میں اس کا رتبہ اونچا ہو جائے گا۔ یہ ایسی غلط فہمی ہے جس میں مغرب جانے والا ہر مشرقی مبتلا ہوتا ہے لیکن مغرب میں گزارا ہوا وقت اسے مشرق کی طرف جسمانی، ذہنی یا جذباتی مراجعت پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس افسانے میں لندن کی ایک جھلک دیکھئے:

> "شیطان کی آنت کی طرح پھیلا ہوا نوے لاکھ باسیوں کا لندن شہر میرے روبرو تھا۔ جہاں ٹیوڈر، وکٹورین عہد کے تعمیر شدہ ایک ہی طرز کے مکانات، شیشے کی جدید بلند و بالا عمارتیں، صاف ستھری سڑکیں، نیم برہنہ سفید، سیاہ، سانولے اور پیلے رنگ کے اجسام، پرکشش لباس، سپر مارکیٹیں، جہازی اسٹورز، زمین دوز گاڑیاں، باغات، تھیٹر، سینما، میوزیم، نائٹ کلبوں، ریستوران، قہوہ خانے، شراب خانے، آرٹ گیلریاں، مختلف

شہریت کے باشندے آزادانہ گھوم پھر رہے تھے۔" **(۲۴)**

اس افسانے میں بھی نسلی امتیاز کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "انجانا کھیل" عورت اور مرد کی نفسیات اور جدید معاشرے میں عورت کی حیثیت پر لکھا گیا افسانہ ہے۔

افتخار نسیم کی بنیادی پہچان شاعری ہے لیکن "شبری"، "ایک تھی لڑکی" اور "اپنی زندگی" جیسے افسانوی مجموعے انہیں ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ثابت کرتے ہیں۔ افتخار نسیم عرف افتی نسیم کے افسانوں میں مشرقی زندگی کے تجربوں کی بازگشت بھی موجود ہے اور مغرب کی نئی جہات کا عکس بھی۔ ان کا افسانہ مغرب کی تہذیبی زندگی کے نئے طرز احساس کا ابلاغ کرتا ہے۔ "گلو" کی کہانی لائل پور (موجودہ فیصل آباد) سے شروع ہوتی ہے۔ لائل پور افتخار نسیم کا بھی آبائی شہر ہے۔ گلنار عرف گلو، زری بالی کی اکلوتی نوجوان اور خوبصورت بیٹی ہے۔ تقسیم کے بعد پناہ گزین مہاجر طوائفوں کا قافلہ بھی آکر اسی چکلے میں آباد ہوا ہے۔ ان پناہ گزینوں کے خلاف دباد با معاندانہ جذبہ لیے، چکلے والے انہیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ ادھر گلو کے بھائی جوئے، چوری چکاری اور منشیات بیچنے کے ماہر ہیں۔ یہ کہانی عمدہ انداز میں شروع ہوئی ہے لیکن انجام تک پہنچتے پہنچتے یہ ایک طوائف اور معاشرے کے درمیان جنگ کی عام روایتی سی کہانی بن جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا اثر کمزور پڑ جاتا ہے۔ افتخار نسیم کا دوسرا افسانہ "کنگ سائز بیڈ" مشرقی روایات کی کشش پر لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں وہی سب مسائل بیان کیے گئے ہیں جو مغرب میں اردو افسانہ لکھنے والے تقریباً تمام افسانہ نگاروں کے ہاں مشترک ہیں۔ "شبری" جنریشن گیپ، مغرب کی مادیت پرستی، خانگی رشتوں کے بکھراؤ اور نسلی امتیاز پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ لیکن اس افسانے کا مرکزی نکتہ "تیسری جنس" کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ تیسری جنس کے افراد کا معاشرے میں کیسا عمل دخل ممکن ہو سکتا ہے۔ "آخری قسط" میں مغربی تہذیب کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ایک جملہ دیکھئے:

"پوری فورٹی سیکنڈ اسٹریٹ ایک میٹ مارکیٹ لگ رہی تھی۔" **(۲۵)**

خالد سہیل ٹورانٹو (کینیڈا) میں مقیم پاکستانی ڈاکٹر ہیں۔ ان کے افسانے فنی لحاظ سے کسی قدر کمزور ہیں۔ زیادہ تر افسانوں میں طنز کی دھار اتنی تیز ہے کہ بعض اوقات افسانہ ہی اس دھار سے زخمی ہو جاتا ہے۔ "جڑیں، شاخیں، پھل" تارکین وطن کے عمومی مسئلے یعنی شناخت کے بحران کو پیش کرتا ہے۔

مغرب میں اردو افسانے کا دامن وسیع تر کرنے کے لیے جن خواتین نے بھی اپنے اپنے حصے کا کردار ادا کیا ہے۔ ان میں صفیہ صدیقی بھی شامل ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "پہلی نسل کا گناہ"، "چاند کی تلاش"، اور "چھوٹی سی بات" شامل ہیں۔ صفیہ صدیقی نے مغرب میں آباد ایشیائی بچوں پر ہونے والے تشدد، جنریشن گیپ اور

تہذیبی ٹکراؤ جیسے مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ مغرب کی خاتون افسانہ نگاروں میں حمیدہ معین رضوی ایسی افسانہ نگار ہیں جو سیدھی سادی کہانی لکھنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ "مردہ لمحوں کے زندہ جسم"، "فن کی دہلیز" اور "اجلی زمین، میلا آسمان" ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔

مغرب میں اردو افسانہ نگاری کی روایت روز بروز مستحکم ہو رہی ہے۔ افسانہ نگاروں کی تعداد اور افسانوں کے معیار کو دیکھتے ہوئے امید کی جاسکتی ہے کہ مغرب میں اردو افسانہ جلد ہی اپنی واضح اور مستحکم حیثیت حاصل کر لے گا۔

حوالہ جات

۱۔ جواز جعفری، ڈاکٹر، "اردو افسانے کا مغربی دریچہ"، یورپ اور امریکہ کے اردو افسانے کا معتبر ترین انتخاب، لاہور، کتاب سرائے، ۲۰۰۹ء، ص: ۱۱

۲۔ عمر میمن، محمد، "چاندنی اور کھمبیاں"، مشمولہ، تاریک گلی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۹ء، ص: ۱۸

۳۔ عمر میمن، محمد، "چاندنی اور کھمبیاں"، ص: ۲۰

۴۔ عمر میمن، محمد، "چاندنی اور کھمبیاں"، ص: ۲۰

۵۔ عمر میمن، محمد، "تاریک گلی"، ص: ۱۰۷

۶۔ عمر میمن، محمد، "تاریک گلی"، ص: ۱۱۷

۷۔ عمر میمن، محمد، "کینچوا اور سورج مکھی"، ص: ۱۲۷۔۱۲۶

۸۔ عمر میمن، محمد، "تاب نظارہ نہیں"، ص: ۱۵۶

۹۔ مقصود الٰہی شیخ، "زیست کا دیباچہ"، مشمولہ، "اردو افسانے کا مغربی دریچہ"، ص: ۴۳

۱۰۔ مقصود الٰہی شیخ، "برف کے آنسو"، مشمولہ، "اردو افسانے کا مغربی دریچہ"، ص: ۵۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۲۔ قیصر تمکین، "خاکستر"، مشمولہ، "اردو افسانے کا مغربی دریچہ"، ص: ۱۷۸

۱۳۔ قیصر تمکین، "سواستکا"، ص: ۱۹۷

۱۴۔ قیصر تمکین، "ٹیولی فیملی"، ص: ۱۸۴

۱۵۔ قیصر تمکین، "اعتراف"، ص: ۱۹۱

۱۶۔ قیصر تمکین، "چراغ تلے"، ص: ۲۰۹۔۲۰۸

۱۷۔ Qaiser Tamkeen, Aik Kahani, Ganga Jamni, Published in, The Annual of Urdu Studies, Vol 10, 1995, on line version, p. 319- 320

۱۸۔ Raza Ali Abidi, Daree, The Annual of Urdu Studies, Vol 13, 1998, on line version, p. N A.

۱۹۔ Raza Ali Abidi, Daree, Aik Gittar Ki Kahani, The Annual of Urdu Studies, do.

۲۰۔ منیر الدین احمد، "جلاوطنی کی قید میں"، مشمولہ، "اردو افسانے کا مغربی دریچہ"، ص: ۲۱۶

۲۱۔ جتندر بلو، "بچھڑتی دھوپ"، ص: ۶۵

۲۲۔ جتندر بلو، "مونگرل"، ص: ۹

۲۳۔ جتندر بلو، "ٹھکانا"، ص: ۱۲۶

۲۴۔ جتندر بلو، "چھلاوہ"، ص: ۱۳۷

۲۵۔ افتخار نسیم، "آخری قسط"، ص: ۴۲